خودی کے بنیادی ستون اور عالمِ اسلام کا فکری اور عملی بہاؤ

The main pillars of khoodi and the intellectual and practical flow of the Muslim ummah

محمد سلیم سرور، پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد
ڈاکٹر ارشاد بیگم، استاد، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد
بادشاہ حسین، ڈائریکٹر (کوالٹی انہانس سیل) شہید بے نظیر بھٹو یونیورسٹی دیراپر

Iqbal did not use the word khodi in his speech under the proposed Persian and Urdu meanings but presented it as a philosophy of life by using it under the mysticism of caste.This is how Iqbal describes the ideology of the self(Khoodi). ”The beginning, the middle and the end of the self(Khoodi) life is everything.Self (Khoodi) Stability is the stability of life. "Iqbal has described the self(Khoodi) as a tool for success from individual level to religion and nation. Iqbal has described self(Khoodi) as the best creative aspect of human life.And we will see in this research article what are the elements of self-training that the Muslim Ummah has turned away from collectively.

Keywords:Khoodi,Ideology of khoodi, Islam and khoodi, Basic elements of khoodi, power of khoodi for individual and nation

اقبال نے خودی کو انفرادی سطح سے لے مذہب وملت تک کی کامیابی تک کا آلہ قرار دیا ہے۔اقبال نے خودی کو انسانی زندگی کا بہترین تخلیقی پہلو قرار دیا ہے اور ہم اپنے اس تحقیقی مضمون میں دیکھیں گے کہ خودی کی تربیت کے وہ کون سے عناصر ہیں جن سے امتِ مسلمہ نے اجتماعی سطح پر منہ موڑا ہے۔

اقبال کے فلسفہءحیات کے سمندر کو ایک لہر کا نام دینا پڑے تو اسے خودی قرار دیا جا سکتا ہے۔اقبال نے خودی کو صدف میں گوہر اور حیات میں جوہر کے مترادف قرار دیا ہے۔اس لفظ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اقبال نے اس لفظ کو رائج اور

مستعمل معنوں سے مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خودی کو اقبال نے عام معنوں سے ہٹ کر خاص پیکر میں استعمال کر کے اس کے معنوں میں ایک جہاں رکھ دیا ہے۔ خودی کا لفظ غرور یا تکبر اور اردو فارسی کے مروجہ معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اقبال نے خودی کو غیرت مندی، جذبہ خودی داری کا احساس و پاس اور اپنی انا کو جراحت و شکست سے محفوظ رکھنے، اپنی حرکت و توانائی کو زندگی کا ضامن سمجھنے اور مظاہر فطرت سے بر سر پیکار رہنے اور دوسروں کا سہارا تلاش کرنے کی بجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خودی کے معنوں کے حوالے سے اقبال نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں اس بات کو واضح کر دیا ہے۔

"ہاں لفظ "خودی" کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی "غرور" استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعینِ ذات ہے"۔ ۱

خودی کے معنوں اور اقبال کی اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی "فروغِ اقبال" میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"نظریہ خودی، حضرت علامہ اقبال کی فکر کا موضوع رہا ہے۔ جس کے تمام تر پہلوؤں پر انہوں نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اقبال نے ابتداء ہی میں اس بات کو واضح کر دیا کہ خودی سے ان کی مراد غرور و نخوت ہر گز نہیں بلکہ اس سے عرفان نفس اور خودی شناسی مراد ہے"۔ ۲

اقبال نے خودی کے انھی معنوں کو اپنے اس اس شعر میں بھرپور طریقے سے بیان کر دیا ہے

خودی کی شوخی و تندی میں کبر وناز نہیں

جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں ۳

خودی کے اس قدر جرات آمیز معنوں کو اقبال نے ایک فرد سے لے کر ایک قوم تک کی لوحِ محفوظ قرار دیا ہے۔خودی کو اپنا لینے سے ایک فرد زندگی کے بحر او قیانوس کو ایک جست میں طے کر جاتا ہے۔زندگی کے حقیقی رازوں کو پانے کے لیے خودی سے شناسائی ناگیزیر ہے۔خودی کے رازوں کو پالینے کے بعد انسان کائنات کے بھیدوں کو اپنی مٹھی میں بند جگنو کی طرح سمجھتا ہے۔خودی نہ صرف زندگی کے بیرونی رازوں کے متعلق آگہی دیتی ہے ہے بلکہ اس کائنات کے نہاں راز بھی انسان پر عیاں ہو جاتے ہیں۔

خودی کیا ہے راز درونِ حیات　　　خودی کیا ہے بیداریء کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے　　　نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے ۴

جب ایک فرد خودی سے مکمل طور پر بہرہ ور ہو جاتا ہے تو اس کی کائنات بیدار ہو جاتی ہے۔یہ وہی کائنات ہے جس کو ایک انسان جگانے کے لیے کبھی چلے کاٹتا ہے اور کبھی رہبانیت اختیار کر تا ہے مگر خودی سے آشنا شخص کسی دوسری دنیا میں جا کر اپنی ذات اور اپنی کائنات تلاش نہیں کر تا بلکہ اس کی بے کراں کائنات خود اس پر افشاں ہو جاتی ہے۔خودی کا اصل مقام انسان کا دل ہے

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے

فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے ۵

خودی انسان کے دل میں ازل سے موجود بلکہ اس سے بہتر صورت یہ کہ خودی کائنات میں ازل سے موجود تھی مگر اس کی کشمکش اس وقت سرخرو ہوئی جب آدمؑ کی صورت میں نمود پائی۔خودی ازل سے ستم رسیدہ تھی اور مقابل قوتوں سے نبرد آزما رہی ہے۔خودی کی اسیری کی طرف اقبال یوں اشارہ کرتے ہیں:

زمانے کے دھارے میں بہتی ہوئی　　　ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر　　　ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر ۶

خودی کی انفرادیت پتھروں اور شجروں کی انفرادیت سے مختلف ہے۔ حیوانات اور نباتات میں انفرادیت ان کی نوع پر منحصر ہے۔ ایک انسان کا دیگر انسانوں سے یا ایک قوم دیگر اقوام سے تفرد ہے تو وہ خودی پر منحصر ہے۔ خودی کی انفرادیت اور اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی کتاب "رُوحِ اقبال" میں لکھتے ہیں:

"ذات یا خودی انفرادیت سے علیحدہ ہے۔ پتھر اور درخت میں انفرادیت ہوتی ہے لیکن وہ خودی کے جوہر سے محروم ہوتی ہے۔ خودی روحانی شے ہے جس کی تعمیر سعی وجہد کے بغیر ممکن نہیں۔۔۔ فطرت کے نظامِ عام میں انسان کی حیثیت حقیر ہے اسی طرح عمرانی طور پر دیکھا جائے تو فرد سوسائٹی کا ایک ادنیٰ جزو ہے لیکن خودی کے تخلیقی عمل مدِ نظر انسان کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں۔ خودی انسان کو مقصود بالذات بناتی ہے اور اسے اپنے مقدر کا احساس کراتی ہے۔ خودی کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ روح نے مادے پر فتح حاصل کر لی ہے۔"[۷]

خودی جب بھی زوال آمادہ ہوتی ہے تو اس سے شخصی اور قومی زوال ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ خودی کو ہر جراحت سے بچا کر رکھنا ہی زندگی کی ضمانت ہے۔ کوئی بھی قوم خودی سے رخ موڑ کر بقائے حیات اور فتح دوام حاصل نہیں کر سکتی۔ زندگی کی تمام تر کامیابیوں کا انحصار خودی کی پرورش سے منسلک ہے۔ کسی فرد یا قوم کے لیے جس قدر سانسیں ضروری ہیں اس قدر ہی اس قوم کے لیے خودی کو آسمان ثریا کا دب اکبر بنائے رکھنا ضروری ہے کیونکہ خودی ہی وہ سوتا ہے جس سے تحریر و تقریر سے لے کر دنیا کی تسخیر تک کے فوارے پھوٹتے ہیں۔ خودی کی حفاظت کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"خودی خود حیات کا دوسرا نام ہے۔ خودی عشق کے مترادف ہے۔ خودی ذوقِ تسخیر کا نام ہے۔ خودی سے مراد خود آگاہی ہے۔ خودی ایمان کے مترادف ہے۔ خودی سرچشمہ ہے اور ذوقِ تخلیق کا ماخذ ہے۔"[۸]

اقبال کے فلسفہ خودی کو زندگی کی قدر و قیمت کے حوالے سے بیان کیا جائے تو زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو خودی کے محیطِ بیکراں سے پرے ہو۔ اقبال نے خودی کو ایک فرد سے لے کر ایک قوم تک کی زندگی کا آغاز اور انجام قرار دیا ہے۔ فرد و ملت کی ترقی و تنزلی خودی کے ترقی و زوال سے پیوستہ ہے۔ خودی کے ترقی و استحکام کے بغیر زندگی کے کسی پہلو میں بھی استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ خودی کی کارکشائیاں بے شمار ہیں۔ خودی کی حفاظت سے انسان کی زندگی کے ایام فقیری میں بھی شانِ شہنشاہی پیدا ہو جاتی ہے۔ خودی ہی کے جذبے کے تحت کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کے تصرف میں آجاتا ہے۔ اقبال اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

خودی ہے زندہ تو ہے فقر میں شہنشاہی　　　ہے سنجر ل وطغرل سے کم شکوہِ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں و حریر۸

انسان کو دنیا میں باقی مخلوق سے افضلیت حاصل ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر خودی جیسا جذبہ موجود ہے جو انسان کو انسانیت کے بلند تر درجے پر فائز کر دیتی ہے۔ یہ خودی ہی کے طفیل ہے کہ فرد ایک منزل کے مل جانے پر رک نہیں جاتا بلکہ اس آگے بڑھ کر دوسری منزل تلاش کرتا ہے۔ خودی افراد کو مشاہدہ فطرت کے پابند بناتی ہے۔ خودی کی منزل زمان و مکاں کی تسخیر پر ختم نہیں ہوتی۔ اقبال کہتا ہے:

خودی کی یہ ہے منزل اولیں　　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تیری آگ اس خاکداں سے نہیں　　　جہاں تجھ سے تو جہاں سے نہیں۹

خودی کا جہانِ موجود سے جہان دیگر تک کا جو سفر ہے اس میں کئی منزلیں پنہاں ہیں اور ہر منزل کی تسخیر کے بعد انسان بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ اس انسان کو یوں لگتا ہے کہ میری خاک اس جہاں سے نہیں بلکہ کسی اور جہاں سے ہے۔ اور اس جہاں کو جو خاک لگی ہے وہ میری ضیاء فلکی کا حصہ ہے۔ اقبال نہ صرف خودی کی حفاظت اور پرورش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں بلکہ ہر اس چیز کے مخالف بھی نظر آتے ہیں جو خودی کو کمزور کرتی ہے۔ خودی کی کمزوری ایسی بیماری ہے جس کے لاحق ہو جانے سے نہ صرف ایک فرد

جذبہء جہاں بینی کھو دیتا ہے بلکہ اپنی ملت کو بھی سستی کے راستے پر گامزن کر دیتا ہے۔ خودی کو کمزور کرنے والی چیزوں کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ ''ولی سے اقبال تک'' میں اشارہ کرتے ہیں:

''اقبال ان سب اثرات کا سخت مخالف ہے جو خودی کو ذرا بھی کمزور کرتے ہیں وہ افلاطون کے گوسفندانہ فلسفے کو اسی لیے ناپسند کرتے ہیں کہ اس نے موت کو زندگی کا انجام قرار دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسی تعلیم خودی کو کمزور کرتی ہے اور خودی کو کمزور کرنے کا یہ حربہ ان اقوام نے ایجاد کیا ہے جو خود کمزور ہیں، اس لیے ان کی خواہش ہے کہ طاقت ور بھی کمزور ہو جائیں''۔۱۰

اقبال کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں کہ زندگی کی قوتوں کو موت کا آئینہ دکھا کر کمزور کیا جائے۔ اقبال اپنی شاعری میں خودی کو کمزور کرنے والے عناصر کے حوالے سے اس حکایت کو بیان کرتے ہیں جس میں یورپ والے شیر کو بکری کا شکار کرنے سے باز رکھنے کے لیے موت کا ڈر سمجھاتے ہیں اور شیر صرف موت کے ڈر سے گوشت کھانا ترک کر دیتا ہے۔ ایسا بزدل فرد ہاتھ پر ہاتھ دھرے صرف موت کا انتظار کر سکتا ہے۔ ایسے افراد پر مشتمل قوم جہاں بینی کی نعمت سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس قوم سے تخلیقی قوتیں روٹھ جاتی ہیں۔ زندگی کے حقیقی ذائقے سے لطف اندوز ہونے کے لیے خودی کے جذبے سے سرشار ہونا از حد ضروری ہے ۔خودی کے بغیر زندگی بے رس کے سے پھل کی صورت اختیار کر کے رہ جاتی ہے۔

خودی کے موت کے ڈر سے مستثنٰی ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کو ازل سے ہی طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزمائی رہی ہے اور زمانے کے ستم سہنے کی ایسی عادت ڈالی ہے کہ اب موت جیسا درد بھی وقتی محسوس ہوتا ہے۔ اقبال خودی کو موت کے مقابلے میں بھی زیادہ طاقت ور ثابت کر دیتے ہیں جب خودی پر موت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ خودی ہی اصل حیات ہے۔ افراد جس قدر کشمکش کا سامنے کرتے ہیں اس قدر ہی ان کی خودی مضبوط ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ ''ولی سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں: ''افراد جس قدر کش مکش اور تحمل و برداشت کے عادی ہوں گے، اسی قدر ان میں خودی کی تکمیل زیادہ ہو گی''۔۱۱

جو افراد اس کش مکش کے حامل ہوتے ہیں وہ اپنی ملت کے لیے جوہرِ نایاب ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کی طبیعت میں جہاں بینی خوب ہوتی ہے وہ کسی بھی مقام کو منزل سمجھ کر رک نہیں جاتے بلکہ ایک سے بڑھ دوسری منزل کی تلاش میں دن رات سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو اقبال نے نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے:

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر

ہزار چشمہ تیرے راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر ۱۲

خودی اگر کسی فرد میں موجود ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہے، کتنی دیرپا ہے اور قوم کے لیے کس قدر کارآمد ہے؟ خودی کو ہر وقت متحرک رکھنے اور پھر اسے تخلیقی جوہر کے طور پر استعمال کرتے رہنے میں ہی اس فرد، قوم اور خودی کی بقا ہے۔ خودی کو زنگ آلود ہونے سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کے مطابق اس خودی کو ایمان کی حرارت سے عشق کی بھٹی میں کندن بناتے رہیں۔ خودی کے دیرپا نقش کے حوالے سے غلام عمر علی خان "اقبال کا تصور خودی" میں لکھتے ہیں:

"اقبال کے نقطہ ء نظر سے وہی خودی اپنا وسیع اور دیرپا نقش زمانے پر ثبت کر سکتی ہے، جو دین الٰہی کے تابع بھی ہو۔ یعنی ان ازلی اقدار کی بقا و اشاعت کو اپنا مقصود اور نصب العین قرار دے، جو اقبال کے الفاظ میں "سود و بہبود ہمہ" (good of all) کے اصول پر مبنی ہیں۔ اس طرح اقبال کے نزدیک صرف وہ صاحب خودی ان کے الفاظ میں "مرد کامل" یا "مرد مومن" ہے جو صاحب خودی ہونے کے ساتھ ساتھ "صاحب فقر" اور "صاحب عشق" بھی ہو۔"۱۳

غلام عمر خان کے الفاظ سے اقبال نے خودی، صاحب خودی اور اس کے نصب العین کے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ اگر کوئی بھی فرد صاحب خودی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ درج بالا اصولوں سے فرار نہیں حاصل کر سکتا۔ ان اصولوں

سے فرار کی صورت میں خودی نہیں رہے گی بلکہ وہ ایک جذبہ بن کر رہ جائے گا جس سے فرد فائدہ حاصل کرنے کی بجائے اپنی قوم کو زیادہ نقصان پہنچائے گا۔خودی ایک ایسا ایٹمی جذبہ ہے جس کے صحیح استعمال سے کسی بھی قوم کے مردہ ترین اور سیاہ ترین پہلوؤں کو روشن کیا جاسکتا ہے۔ محمد یونس حسرت اپنی کتاب "حکایات اقبال" میں خودی کی اہمیت اور حفاظت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"سنو! اگر کوئی مسلمان، نادر اور مفلس ہو، اُسے تن ڈھانپنے کو کپڑا میسر ہو اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی، لیکن اس ناداری اور مفلسی کی حالت میں وہ اپنی خودی کی حفاظت کر سکے ، کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرے اور اپنی کسی ضرورت کے سلسلے میں کسی سے کوئی توقع نہ رکھے تو وہ ظاہری طور پر فقر اور مفلس ونادار ہونے کے باوجود ایک دن ساری کائنات پر حکمران ہو جائے گا بلکہ اِس دنیا کے علاوہ عقبیٰ کا بھی مالک بن جائے گا۔"۱۴

خودی کے اس بحران کو کیسے کم کیا جاسکتا ہے اور کونسی ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے خودی جیسا دُر مراد نایاب ہو تا جارہا ہے۔خودی کی تربیت کے ابتدائی عناصر میں کمی آرہی ہے جس میں سے ایک عنصر اطاعت الٰہی بھی شامل ہے۔جب اطاعت الٰہی کمزور پڑے گی تو افراد اپنی مرضی کرنے کے عادی ہو جائیں گے ۔جب افراد اپنی مرضی کے عادی ہوں گے تو ان کے مقدس اور طاقتور جذبات بے مقصد استعمال ہوں گے۔ کسی بھی قوم کے افراد کے جب اس قدر قیمتی جذبات بے مقصد راہوں کے مسافر بنیں گے تو ان جذبات سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو گا۔تو اس ضمن میں ایسے کہا جاسکتا ہے کہ خودی کے ابتدائی مراحل میں خودی کو آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اس کو اسلامی معاشرہ میں اطاعت الٰہی کے سپرد کر دینا چاہیے جس سے ایک فرد اور ایک قوم کے حق میں بہتر نتائج بر آمد ہوں گے۔اس حوالے غلام عمر خان "اقبال کے تصور خودی" میں لکھتے ہیں:

"ایک اسلامی معاشرہ میں فرد، کو خودی کی نشوونما کے ابتدائی دو مراحل میں بیخودی یا ملی خودی کا پابند ہونا پڑتا ہے۔اور جب فرد اس مرتبہ بلند تک رسائی حاصل کرلے، جہاں وہ قانون الٰہی کی ازلی اور ابدی صداقت کو، بذات خود دریافت کرلے، تو پھر خودی کی آزاد

حرکت کے لیے کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس مرتبہ پر پہنچ کر خود خدا کی مرضی،

مرد کامل کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے، اور اس آزاد شخصیت، معاشرے کے حق میں قوت

وحیات کا سرچشمہ، اور نوع انسانی کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہے۔''۱۴

ایسی خودی نہ صرف اس فرد کے لیے بلکہ اس قوم کے لیے ایسی صدف بن جاتی ہے جس میں موجود قطر نیساں لازماً گوہر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ایسی قوم زندگی کے سب سے بڑے خوف موت سے بھی بے خطر ہو جاتی ہے اور اس قوم کو اپنی حیات لافانی نظر آتی ہے۔ جب کوئی بھی قوم بے خطر ہو کر دنیا کی تسخیر میں نکلے گی تو اس قوم کو یہ دنیا بند مٹھی میں جگنو کی طرح نظر آئے گی۔ ایسے ہی ایک اہم نکتے کی طرف اقبال یوں اشارہ کرتے ہیں:

زندگانی ہے صدف قطرہء نیساں ہے خودی　　　وہ صدف کیا جو قطرے کو گوہر نہ کر سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی　　　یہ بھی ممکن ہے تو موت سے بھی نہ مر سکے ۱۵

جب خودی کو اس مقام تک پہنچایا جائے تو اس بعد آسمان کے ستارے بھی اس مرد کامل کے اشاروں کا انتظار کرتے ہیں۔ خودی کے جذبات کا موجود ہونا بعض اوقات فطری عمل بھی ہو سکتا ہے جیسے اقبال کی نظر کے مطابق ہٹلر اور مسولینی میں بھی خودی موجود تھی مگر اُس خودی کی تربیت نہیں تھی اور وہ لوگ اس لیے اس بڑے جذبے کو ویسے استعمال کرنے میں ناکام رہے جیسے اس جذبے کو استعمال کیا جانا تھا۔ اس لیے یہ بات بھی حد درجے ضروری ہے کہ خودی کو ان حدود و قیود کے اندر رکھ کر اس کا استعمال کیا جائے جو اس کی ابتدائی حدود ہیں۔ اقبال نے اپنے ایک دوسرے شعر میں خودی کے حامل فرد کو سمندر میں آزاد مگرمچھ سے تشبیہ دی ہے جو سمندر میں موجود لہروں سے گھبرانے کی بجائے ان سے ٹکراجاتا ہے اور سمندر میں جس طرف چاہتا ہے جا سکتا ہے اور اس کے برعکس وہ مرد جو خودی کی حیات سے محروم ہے اس کے لیے دشت کو عبور کرنا بھی مشکل ہے۔

نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد

نہنگِ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر۱۶

کسی فرد یا قوم کے لیے نہنگ مردہ بننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنی خودی کو فراموش کر بیٹھے یا اس کی حقیقت کو تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ اصل میں اہمیت اس بات کی نہیں کہ لہروں سے ٹکرانا مشکل ہے یا سراب کو پار کرنا، ناممکن ہے بلکہ اہمیت کی حامل یہ بات ہے کہ خودی کو زندہ اور تربیت یافتہ رکھا جائے۔

جہانِ خودی کا بھی صاحب فراز ونشیب یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے ناخوب

نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو وہ جمیل جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب ۱۷

اقبال کی نظر میں خودی بھی ایک مکمل جہان ہے جس میں اچھائی اور برائی ایک دوسرے بر سرِ پیکار رہتی ہیں۔ اچھائی کی بنیاد یہی ہے کہ ہر چیز خودی کی حامل ہو۔ خودی کے اس جہان سے ایک اور اہم بات سامنے آئی ہے کہ ہم کسی چیز کی کیسے پہچان کر سکتے ہیں کہ وہ بلندی کی حامل ہے یا پستی کی حامل ہے تو اس کا معیار خودی ہی ہے جو چیز خودی کے مطابق ہو گی وہ بلندی کی حامل ہو گی۔ امتِ مسلمہ میں اگر آج اعلیٰ سے اعلیٰ چیز بھی اچھائی اور بلندی کے معیار پر نہیں پہنچ پاتی تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہ کارنامہ یا چیز خودی کے جذبے یا خودی کے معیار سے محروم ہوتا ہے۔ ماضی میں مسلمان غالب کیوں تھے اور آج ناکام کیوں ہیں اس حوالے سے اعجازِ اقبال میں ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

قدیم اسباب ایسے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کا شعورِ خودی زندہ تھا۔

مسلمانوں کے ملی وجود کے صالح عناصر نے فاسد عناصر کی سخت مزاحمت کی۔ بعض

ملی کمزوریوں کے باوجود، اسلام کے غلبے اور اس تہذیب کی سالمیت کے بارے میں

ان کا یقین پختہ رہا، لیکن دورِ جدید نے مسلمانوں سے ان کا یہ یقین چھین لیا ہے۔" ۱۸

خودی کے جذبے سے سرشار فرد یا قومیں تو بلند معیار کی حامل بن جاتی ہیں مگر ان اقوام کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جو خودی کے حقیقی جذبے سے محروم ہیں۔ اقبال نے ضربِ کلیم کی ایک نظم "مرگِ خودی" میں یورپ، عرب، ایران اور عراق کے نام لے کر کہا ہے کہ ان اقوام کی خودی کے مر جانے سے یہ قومیں اپنی اصل حرارت اور قوت کھو چکی ہیں۔ یورپ بھی باطنی طور پر مردہ ہو

چکاہے اور ایران اور عراق کی ہڈیاں بھی گودے سے محروم ہو چکی ہیں۔جب ہندی مسلماں خودی سے محروم ہوئے تو وہ آشیانہ بھول کر قفس میں جاقید ہوئے۔

خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہء احرام۱۸

خودی کی موت سے ہی قومیں آزادی جیسی نعمت کا سبق بھول جاتی ہیں یہی وہ سبق ہے جس کو آج امتِ مسلمہ بھلا چکی ہے۔خودی کی موت کے ساتھ امتِ مسلمہ اپنی اقدار کھو بیٹھی ہے۔خودی کے کمزور پڑتے ہی پیرِ حرم مسلماں کا جامہ بیچ کھانے لگا مطلب حج جیسے اہم فریضے پر بھی ٹیکس کو مسلمان پیشوا اپنی دولت مندی کا سامان سمجھنے لگے۔خودی افراد کو صرف بلند مقاصد کے حصول کے لیے سرگرداں ہی نہیں کرتی بلکہ اسلامی اقدار کو بھی بحال رکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔خودی کو کھونے کے ساتھ ہی مسلمان زندہ لاشیں بن کر رہ گئے بلکہ یوں کہیں کے مٹی کے مادھو بن کر رہ گئے اور یہ مٹی کے مادھو امتِ مسلمہ کے پیشوا کیوں کر بن سکتے ہیں۔جو قومیں اپنی خودی کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتیں ، محکومی و غلامی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ادب،دین اور آزادی کی حفاظت و سربلندی خودی کی حفاظت کے ساتھ منسلک ہے۔ادب برائے ادب کا کوئی فائدہ نہیں،اقبال کی نظر میں ادب برائے حیات ہی اصل ادب ہے اور اصل حیات خودی سے پیوستہ ہے۔خودی کی غیر موجودگی میں مذہب و ادب فسانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

امت مسلمہ میں خودی کے بحران کے جو چند بڑے عناصر ہیں ان کا صفحاتِ بالا میں تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے قصہ مختصر امت مسلمہ میں اتحاد کی کمی،ایمان کی کمزوری،ارادوں کا غیر مستحکم ہونا،ہر وقت دل میں موت کا ڈر رکھنا،خودی کی حقیقی طاقت سے ناآشنائی اور حالاتِ زمانہ سے نبرد آزمائی کی قوت کا ناپید ہونا۔درج بالا مایوس کن عناصر نے مل کر امتِ مسلمہ میں خودی جیسے لافانی جذبے کو مضمحل کر دیا ہے۔

اسی لیے اقبال نے جہاں خودی کو پہچاننے پر زور دیا اس کے ساتھ ساتھ اس کی تربیت پر بھی زور دیا ہے تاکہ دنیا کو تسخیر کرنے والا جذبہ زنگ آلود نہ ہونے پائے۔ خودی کو جہاں بین اور قوتِ تخلیق جیسی طاقت سے آباد رکھنے کے لیے اطاعتِ الٰہی کی آبِ حیات سے زرخیز اور عشق کی چمک دمک سے روشن اور تر و تازہ رکھنے کی ضرورت ہے۔

اقبال کے تمام تصورات میں باطنی اعتقاد کی بڑی اہمیت ہے۔ جس شخص کا اعتقاد جس قدر مضبوط ہو گا وہ اسی قدر ہی اپنے خودی کے جذبے کا بہترین استعمال اور بہترین دفاع کر سکے گا۔ خودی کے اعتقاد کے حوالے سے پروفیسر غلام عمر خان اپنی کتاب ''اقبال کا تصور خودی'' میں لکھتے ہیں:

> ''لیکن کائنات کے ان بے شمار قابلِ مظاہر میں سے ایک شے یقیناً ایسی ہے جس کا ہونا راست طور پر ثابت ہے، اور جس کے ہونے پر اگر شک بھی کیا جائے تو اس سے بھی اس کا ہونا ہی ثابت ہوتا ہے، اور یہ شک کرنے اور سوچنے والے کا ذہن، اس کا انا یا شعور ہے۔ کیونکہ سوچنا بجائے خود ہونے پر دلیل ہے۔ بلکہ ڈیکارٹ کے الفاظ میں ہونا خود سوچنے پر مبنی ہے۔ ''کیونکہ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں''۔ ساری کائنات کے ہونے یا نہ ہونے پر شک کیا جاسکتا ہے لیکن اس ''انا'' سے جو راست طور پر خود اپنے حقیقی ہونے کا شعور رکھتا ہے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی 'میں' یا 'انا' کائنات میں ایک ایسی شے ہے جو حق ہے۔''۱۹

کائنات کی ہر شے سے انکار کیا جاسکتا ہے مگر جس طرح ایک انسان اپنے خالق کا انکار نہیں کر سکتا اسی خالق کے نائب اور پھر اس نائب میں موجود انا مطلب خودی کا انکار نہیں کر سکتا۔ جو چیز موجود ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا وہ اس چیز کے حامل انسان پر منحصر ہے۔ خودی ایسی چیز ہے جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے کیونکہ اس کا ہونا دنیا کے کسی بھی خزانے سے کم نہیں اور یہ وہ خزانہ جو صحیح استعمال پر پہلے سے بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسے بھی لی جاسکتی ہے جس جسم میں جس قدر زیادہ خون، گوشت اور حوصلہ ہو گا، وہ جسم اُس قدر ہی طاقت ور ہو گا اور وہ جسم مشکل سے مشکل کام کو بھی سر انجام دے سکے گا۔ جس

طرح جسمانی طاقت کی اہمیت ہے بالکل اسی طرح روحانی طاقت کی بھی اہمیت ہے، جس کا نام خودی ہے۔ اگر طاقت ہوتے ہوئے بھی کوئی انسان اس سے کوئی مثبت کام نہیں لیتا تو یہ اس کی ناکامی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی جیسے ایک انسان اپنی خودی کو پہچان کر اس کی پرورش کرکے اس سے مثبت کام نہیں لیتا تو اس شخص کی روحانی طاقت ایسے ہی بے کار ہے جیسے ایک بیمار شخص کے لیے اس کی جسمانی طاقت بے کار ہوتی ہے۔ اقبال نے زندگی کی واحد حقیقت خودی کو قرار دیا ہے۔خودی کی حقیقت کے حوالے سے "فلسفہ ءاقبال" میں لکھا ہے:

> "اقبال کا قول ہے کہ تجربے کا مرکز یا دماغ یا خودی ہی ہیں دنیا میں تنہا ایک حقیقت ہے؛ یہ خودی جسے اقبال "واحد حقیقت" قرار دیتے ہیں، محض ھیگل کا "تصور" اور بریڈلے (Bradley)کا تجربہ (حسی ادراک) نہیں بلکہ پوری شخصیت ہے۔ شخصیت بھی وہ جو کشمکش یا مستعدی و بیداری کی حالت میں ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے (۱) شخصیت وہ خودی ہے جو نہ صرف ان تاثرات کی حامل ہوتی ہے جو کی اس کی موجودہ زندگی کے دور ماضی میں خارجی مہیجات کے ردِ عمل سے پیدا ہوتے رہے ہیں بلکہ مزید بر آں آفرینش سے اب تک کے تمام موروثی تاثرات کی جامع بھی ہوتی ہے؛"۲۰

خودی سے کیسے کام لیا جائے اور خودی کو کیسے پہچانا جائے! یہ بھی ایک اہم سوال ہے کیونکہ خودی انسان کے نظامِ فکر کا حصہ ہے اور فکر کا دارومدار توجہ پر ہے مطلب ایک انسان کسی بات کے حوالے سے جس قدر انہاک سے کام لیتا ہے اور اس کے بعد اس سے ویسا ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنی فکر کو پہچاننے میں ناکام رہتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو پہچاننے اور اس سے بجا طور پر کام لینے میں ناکام رہا ہے۔ خودی انسان کے نظامِ فکر اور زمانی اعتبار سے تمام ادوار کا احاطہ کیے ہوئے اس لیے اس کو پہچاننا نہایت ضروری ہے۔ خودی نظامِ فکر کا حصہ ہے اس حوالے سے اقبال اپنے خطبے "انسانی خودی اس کی آزادی اور لافانیت" میں لکھتے ہیں:

"خودی کی تشکیل زندگی کے محسوسات سے ہوتی ہے اور یوں وہ نظامِ فکر کا حصہ ہے۔ فکر کا ہر موجود اور گزرا ہوا ارتعاش ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ جس میں علم اور یادداشت دونوں موجود ہوتے ہیں۔ لہذا گزرے ہوئے ارتعاش سے ابھرے ہوئے اور ابھرے ہوئے ارتعاش سے اس کے بعد ابھرنے والے ارتعاش سے کام لینے کا نام خودی ہے۔"۲۰

خودی کی تشکیل کے حوالے سے اقبال نے جو بات کی ہے اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ خودی زندگی کے محسوسات سے تشکیل پاتی ہے۔ محسوسات نظامِ فکر ہی کا نام ہے اور نظام فکر کا ماضی، حال اور مستقبل جڑا ہوا ہوتا ہے۔ خودی کے حوالے سے اس سے یہ مطلب یہ لیا جاسکتا ہے اگر ایک انسان یا ایک قوم حال میں اپنی خودی کو پہچان لیتی ہے تو وہی خودی مستقبل میں بھی اس کی رہبر ور ہنما ہو گی۔ خودی تک پہنچنے کا راستہ شعوری تجربے کی توجیہہ ہی واحد راستہ ہے۔ شعور کیونکہ ایک جوئے خیال ہے اور ہر لمحہ اتار چڑھاؤ کا شکار ہتا ہے مگر ان مختلف خیالات کو مجتمع رکھنا ہی خودی کی حیات ہے۔ خودی زندگی میں زندگی سے ہی حاصل ہوتی ہے اور زندگی کے لیے ہی رہبر ہوتی ہے۔ جو قوم زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا چاہتی ہے اسے چاہیے کہ موت سے ڈرنے کی بجائے اپنی خودی کو پہچانیں اور اس کی حفاظت کریں۔ خودی اور زندگی کے تعلق کے حوالے سے اقبال اپنے خطبات میں لکھتے ہیں:

"زندگی خودی کی سرگرمیوں کے لیے مواقع فراہم کرتی ہے اور موت خودی کے ترکیبی عمل کا پہلا امتحان ہے۔ کوئی عمل بھی مسرت افزا یا اذیت ناک نہیں ہوتا: وہ صرف خودی کو قائم رکھنے یا برباد کرنے والا ہوتا ہے۔ خودی کو اعمال ہی زوال کی طرف لے جاتے ہیں یا انہیں مستقبل کے کردار کے لیے تربیت فراہم کرتے ہیں۔ خودی کو برقرار رکھنے والے عمل کا اصول ہے کہ ہم دوسروں کی خودی کا احترام کریں۔ چنانچہ ذاتی بقائے دوام ہمارا کوئی حق

نہیں، یہ محض ذاتی کوشش سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔"۲۱

ہمارے اعمال ہماری خودی کو اس قدر مستحکم کر دیں کہ ہماری خودی دائمی زندگی پالے اور موت جیسا ہیبت ناک راستہ بھی ابدی منزل کا ایک زینہ ہی نظر آئے۔ جب خودی اس قدر مضبوط ہوگی تب موت سے صرف ہمارا جسم ختم ہوگا اور ہماری خودی مختلف صورتوں میں ہمیشہ سلامت رہے گی۔ اعمال کا جس قدر گہرا اثر ایک شخص کی زندگی پر ہے بالکل اسی طرح ایک قوم کے لیے بھی اپنے اعمال کی اصلاح اور ان کو خودی کے ساتھ جوڑے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ جو قوم چاہتی ہے کہ وہ ارضی نقشے پر ایسا نام اور مقام پائے جس پر باقی دنیا رشک کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کو خودی کے تابع کر لے۔ شتر بے مہار اور خودی سے فرار پانے والی قومیں دنیا میں بقا تو درکنار نام بھی نہیں بچا پاتیں۔ امتِ مسلمہ نے جب خودی کو ایسے ہی پہچانا ہوا تھا جیسے پہچاننے کا حق ہے تو اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی مسلمانوں کے نام سے دہل جاتی تھی لیکن جونہی اعتقاد کمزور پڑا اور خودی کا سبق بھلا دیا تو دنیا میں ان کے زوال کا دور شروع ہو گیا۔ یہ وہی امتِ مسلمہ تھی جس کے علم و ہنر کی مثالیں دنیا دیا کرتی تھی اور پھر مغلوبیت کے دور میں ان کے علمی ورثے سے دوسرے مستفید ہو کر اپنی خودی کو پہچاننے لگے۔ خودی کو قائم و دائم رکھنے کے حوالے سے ڈاکٹر شبنم منیر اپنی کتاب "تصوف اور اقبال کا نظامِ فکر" میں لکھتی ہیں:

"اقبال نے جو خودی کا پیغام دیا، خودی کو نکھارنے کا طریقہ بتایا ان سب کا اگر مختصر میں اظہار کریں تو بس تین لفظوں میں کہہ سکتے ہیں۔ (۱) اثباتِ خودی (۲) استحکام خودی (۳) توسیعِ خودی۔۔۔ اور ان سب کو نور بخشنے والا مخرج و منبع ہے عشقِ رسول ﷺ۔ ۔۔ اور اسی لیے انہوں یہ بھی کہا کہ۔۔ "ہر مسلمان پر خودی کا استحکام فرض ہے۔"۲۲

خودی کو مضبوط و مستحکم بنائے رکھنے کے لیے عشقِ رسول کا ہونا ضروری ہے۔ خودی کی آبیاری عشق کے پانی سے ہوتی ہے۔ عشق رسول کریم ﷺ کی ذات سے ہو گا تو خودی کا وجود دائمی ہو جائے گا اور اسی عشق کا جذبہ جب ہم دنیاوی مقاصد سے جوڑ لیں گے تو مقاصد ہمارا جنون بن جائیں گے۔ عشق خودی کے جذبے کے لیے آکسیجن کا کام کرتا ہے۔

جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی

آہ کہ یہ تیغ تیز پردگی نیام بھی!۲۲

خودی کو تیز کرنے میں ایک مرحلہ عشق کا بھی آتا ہے مگر اس مرحلے پر بھی امت مسلمہ کے حوالے سے اقبال نے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ یہ تیغ بھی ابھی نیام میں ہی ہے۔ عشق ایک انسان اور ایک قوم کے اعتقاد میں ہیرے کی سی مضبوطی پیدا کر دیتا ہے۔ مضبوط اعتقاد کسی بھی منزل کی طرف اٹھے ہوئے قدم کی ضمانت ہے اور اعتقاد عشق ہی کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ عشق خودی تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔

اس بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خودی کو پہچاننے کے لیے شعور کو مجتمع کرنا ضروری ہے اور پھر اس شعور کو اطاعت الٰہی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلا کر عشق کے اعتقاد کے ذریعے خود کی منزل تک پہچایا جا سکتا ہے۔

اقبال نے اس مضبوط قلعے کے تین بنیادی مرحلے بتا دیے ہیں جن میں سے پہلا مرحلہ اطاعت الٰہی ہے۔ جس طرح ایک معاشرے میں ایک انسان کو دوسرے انسان کے شر سے بچانے کے لیے کچھ قوانین بنائے جاتے ہیں بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بھیج کر شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کے لیے کچھ ضابطے طے کر دیے ہیں اور ان ضابطوں میں سے بنیادی ضابطہ اطاعت الٰہی ہے۔ اطاعت الٰہی کے حوالے پروفیسر شبیر افضل خان اپنی کتاب ''علی شریعتی کے انقلابی افکار اور اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''شریعتی کے نزدیک اطاعت یہ ہے کہ انسان جتنا بھی زیادہ خدا کے سامنے تسلیم ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وہ خدا کا قریبی ہو جاتا اور کا انتہائی مقصد بن جاتا ہے۔ اس طرح انسان کا آفرینش کا مقصد جو کہ اس قدر ہیجان انگیز ہے، جلد پایہء اثبات کو پہنچتا ہے۔''۲۳

اطاعت الٰہی کا فائدہ بھی انسان کو ہی ہے کہ وہ اپنی روحانی اور جسمانی طاقت کو فضولیات پر صرف کرنے کی بجائے مثبت راستے پر استعمال کرتا ہے۔ انسان جس قدر خدا تعالیٰ کے قریب ہو گا اس قدر اس کا باطن مضبوط تر ہو تا چلا جائے۔ خودی، خدا اور خود کے تعلق ہی کا دوسرا نام ہے۔

دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے۔ جو انسان خود کو اطاعت الٰہی کے سپرد کر دیتا ہے تو پھر وہ اپنے نفس کا غلام بننے کی بجائے نفس کو اپنا غلام بنالیتا ہے۔ اسی کامیابی کو خودی کا نام دیا جاتا ہے۔ ضبط نفس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی غیر ضروری خواہشات کا غلام نہ بنے۔ انسان جب خواہشات کا غلام نہیں بنے گا تو اس کی خواہشات کسی ابدی خواہش کے تابع ہو جائیں گی۔ اس ابدی خواہش کا نام مذہب کا دائرہ ہے۔ اقبال نے نفس پر ضبط رکھنے کے حوالے عبادات کا بجالانے کا حکم دیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر شبیر افضل خان اپنی کتاب ''علی شریعتی کے انقلابی افکار اور اقبال'' میں اقبال کے درج ذیل شعر درج کرتے ہیں:

هر که بر خود نیست فرمانش رواں　　　　می شود فرماں پذیر از دیگراں

طرح تعمیر تو از گل ریختند　　　　با خوف را محبت آمیختند

حب مال و دولت و حب وطن　　　　حب خویش و اقربا و حب زن

تا عصائے لا الٰہ داری بدست　　　　ہر طلسم خوف را خواہی شکست ۲۴

اقبال کہتا ہے دیگر خواہشات سے بچ کر عبادات کو اپنانا ہی ضبطِ نفس ہے۔ اقبال کے نزدیک نماز، روزہ حج اور زکوۃ سے ضبطِ نفس حاصل ہوتا ہے اور ضبطِ نفس خودی کے ابتدائی مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے۔

ان دو مراحل سے گزرنے والے انسان کے لیے نیابت الٰہی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک قوم جب ان مراحل کو کامیابی سے طے کر لیتی ہے یا ان پر پورا اترتی ہے تو اس کے لیے دنیا میں پہلا انعام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم باقی قوموں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔ اس بات کی مثالیں اقبال کے کلام میں جابجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال برصغیر کی غلام امتِ مسلمہ کو ان کے ماضی کے قصے سنایا کرتے تھے کہ جب تم لوگ اتحاد، اعتقاد سے پیوستہ اور خودی سے آراستہ تھے تو حاکم تھے اور آج اپنی خودی سے دوری

اختیار کرنے کی وجہ سے حاکم سے محکوم کے درجے پر آچکے ہو۔خودی کو پہچان لینے سے ناصرف دنیامیں مقام ملتاہے بلکہ بقا بھی اس قوم کامقدر ٹھہرتی ہے اور موت اس قوم کاخاتمہ نہیں بلکہ ابدی منزل تک کاصرف ایک راستہ ہے۔

حوالہ جات:

۱۔محمد اقبال،علامہ،اسرارِخودی،ایڈیشن(پہلا)،یونین سٹیم پریس،لاہور،۱۹۱۵ء،ص ۴

۲۔افتخار احمد صدیقی،فروغِ اقبال،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور،۱۹۹۶ء ص۸۵

۳۔محمد اقبال،علامہ،کلیاتِ اقبال(ساقی نامہ)،اقبال اکادمی لاہور،۲۰۱۵ص

۴۔ایضاً ص۴۵۵

۵۔ایضاً ص۴۵۶

۶۔ایضاً۴۵۵

۷۔یوسف حسین خان،ڈاکٹر،روحِ اقبال،القمر انٹرپرائزز،لاہور،۱۹۹۶،ص۱۴۴

۷۔سید عبداللہ،ڈاکٹر،ولی سے اقبال تک،سنگِ میل پبلیکشنز،لاہور،۲۰۰۰ء،ص۲۷۵

۸۔خواجہ حمید یزدانی،شرح ضربِ کلیم،سنگ،میل پبلیکشنز،لاہور،۲۰۰۵،ص۷۵

۹۔محمد اقبال،علامہ،کلیاتِ اقبال(ساقی نامہ)،اقبال اکادمی لاہور،۲۰۱۵،ص۴۵۷،۴۵۶

۱۰۔سید عبداللہ،ڈاکٹر،ولی سے اقبال تک،سنگ میل پبلیکشنز،لاہور،۲۰۰۰ء،ص۲۷۶

۱۱۔ایضاً ص۲۷۷

۱۲۔خواجہ حمید یزدانی،شرح ضربِ کلیم،سنگ،میل پبلیکشنز،لاہور،۲۰۰۵،ص۵

۱۳۔ غلام عمر خان، تصورِ خودی، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، ۱۹۶۶، ص ۱۳

۱۴۔ محمد یونس حسرت، حکایاتِ اقبال،، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۹، ص ۱۶۰

۱۴۔ ایضاً ص ۱۴

۱۵۔ خواجہ حمید یزدانی، شرح ضرب کلیم (حیات ابدی)، سنگ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۲۹

۱۶۔ ایضاً ص ۷۵

۱۷۔ ایضاً ص ۷۹

۱۸۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اعجازِ اقبال، سنگ، میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۰۴، ص ۴۳۶

۱۸۔ خواجہ حمید یزدانی، شرح ضرب کلیم (خوب وزیشت)، سنگ میل پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء ص ۸۰

۱۹۔ غلام عمر خان، تصورِ خودی، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد، ۱۹۶۶، ص ۳۲،۳۱

۲۰۔ فلسفہ ءاقبال، (مرتبین)، بزمِ اقبال، مکتبہ جدید پریس، شارع فاطمہ جناح، لاہور، ۱۹۸۴ء ص ۳۰۳

۲۰۔ محمد اقبال علامہ، مترجم (ڈاکٹر وحید عشرت) تجدید فکریاتِ اسلام، اقبال اکادمی پاکستان، ص ۹۸

۲۱۔ ایضاً ص ۱۲۱

۲۲۔ شبنم منیر، ڈاکٹر، تصوف اور اقبال کا نظامِ فکر، آر۔ آر۔ پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۰، ص ۲۵۱

۲۲۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (ساقی نامہ)، اقبال اکادمی لاہور، ۲۰۱۵، ص ۴۳۷

۲۳۔ شبیر افضل خان، پروفیسر، علی شریعتی کے انقلابی افکار اور اقبال، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۷ ص ۲۰۶

۲۴۔ ایضاً ص ۲۰۷،۲۰۶